تدبّرِ قرآن

۱۰۳

العصر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سورہ کا مضمون، سابق سورہ سے تعلق اور ترتیب بیان

سابق سورہ ——— التکاثر ——— میں ان لوگوں کو تنبیہ فرمائی گئی ہے جو ساری عمر اسی دنیا کے مال و متاع جمع کرنے کی تگ و دو میں گنوا بیٹھتے ہیں یہاں تک کہ موت کی گھڑی آجاتی ہے اور انھیں یہ سوچنے کی فرصت کبھی نہیں ملتی کہ یہ عمر عزیز اللہ تعالیٰ نے انھیں کس مقصد بلند کی خاطر عطا فرمائی اور وہ اس کو کس لوالہوسی وبے حاصلی میں برباد کر بیٹھے۔ اگر وہ جانتے کہ ایک دن تمام نعمتوں کی طرح زندگی کی عظیم نعمت سے متعلق بھی ان سے سوال ہوگا کہ اس کو انھوں نے کس کام میں صرف کیا تو وہ ہرگز یہ حماقت نہ کرتے کہ جس چیز سے وہ ابدی بادشاہی حاصل کر سکتے تھے اس کو دنیا کے خزف ریزے جمع کرنے اور اپنے لیے ابدی لعنت کا سامان کرنے پر قربان کر دیتے۔ اب اس سورہ میں بتایا ہے کہ زندگی کی اصل قدر و قیمت کیا ہے؟ کیا چیز اس کو ابدی فلاح کی ضامن بناتی ہے اور کیا چیز اس کو دائمی خسران میں تبدیل کر دیتی ہے؟ کس طرح انسان اس کو اپنے لیے رحمت بنا سکتا ہے اور کس طرح یہ آپ سے آپ اس کے لیے نقمت اور عذاب بن جاتی ہے اگر وہ اس کو رحمت بنانے کی کوشش نہ کرے۔

اس حقیقت کو سمجھانے کے لیے اس میں زمانہ کی قسم بطور شہادت کھائی گئی ہے کہ انسان غور کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ اس دنیا میں اصل سرمایہ جو اسے حاصل ہے بس وہ تھوڑا سا وقت ہے جو مہلتِ حیات کی حیثیت سے اس کے حصہ میں آیا ہے۔ اس کو صحیح استعمال کر کے وہ زندگی بخشنے والے کا پسندیدہ بندہ بھی بن سکتا اور 'رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً' کا مقام بھی حاصل کر سکتا ہے اور اسی کو غلط کاموں میں ضائع کر کے ہمیشہ کے لیے اپنے کو دوزخ کے عذاب کا سزاوار بھی بنا سکتا ہے۔ اس کی فطرت یہ ہے کہ ایک شمشیرِ دو دم ہے۔ اس کو انسان نے اگر اپنے حق میں استعمال نہ کیا تو یہ آپ سے آپ اس کے ابدی دشمن ——— شیطان ——— کے حق میں استعمال ہوگا۔ اس کا بہت تھوڑا سا حصہ یعنی صرف حاضر ہے جو اس کے اختیار میں ہے جس میں وہ کوئی تصرف کر سکتا ہے، باقی یا تو ماضی بن چکا جو کسی قیمت پر بھی واپس نہیں مل سکتا یا مستقبل کے پردوں میں چھپا ہوا ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ کتنا ہے اور ہے بھی یا نہیں اور ہے تو وہ اپنے ساتھ کیا احوال و مسائل اور کیا تقاضے و مطالبے

دکھتا ہے۔ جو وقت آتا ہے وہ اپنے مطالبے اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ انسان حاضر کے فرض کو مستقبل پر ٹال سکے۔

اس اہم حقیقت کی طرف توجہ دلانے کے بعد وہ صحیح طریقہ بتایا ہے جس کو اختیار کرنے والے اپنی مہلت حیات سے صحیح فائدہ اٹھاتے اور اس حیات چند روزہ کے بدلے حیات جاودان پاتے ہیں۔ اگرچہ یہ طریقہ صرف چند لفظوں میں بتایا گیا ہے لیکن ایسے جامع اور حکیمانہ اسلوب میں بتایا گیا ہے کہ انسان تدبر کرے تو اس کو معلوم ہو جائے گا کہ اس کی انفرادی اور اجتماعی دونوں زندگیوں سے متعلق اس پر کیا فرائض عائد ہوتے ہیں جو اسے ادا کرنے ہیں اور جن کے ادا کرنے ہی پر اس کی ابدی فلاح کا انحصار ہے۔

غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ قرآن کا بھی اصل مقصد اسی صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کرنا اور انسان کی شخصی و اجتماعی زندگی کو آخرت کے نصب العین کے تحت منظم کرنا ہے۔ گویا جو بات قرآن کی ایک سو چودہ سورتوں میں سمجھائی گئی ہے وہ اس سورہ کی تین آیتوں میں سمو دی گئی ہے۔ اسی حقیقت کی طرف حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یوں اشارہ فرمایا ہے کہ "اگر لوگ تنہا اسی سورہ۔ العصر۔ پر غور کریں تو ان کے لیے کفایت کرے۔"

سُوْرَةُ الْعَصْرِ

مَكِّيَّةٌ ـــــــــــــــــــ اٰيات : ۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْعَصْرِ ① اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ② اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ③ آیات ۱-۳ ع ۱ ۲۸

زمانہ شاہد ہے کہ انسان گھاٹے میں ہے بجز ان کے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی ۔ ۱-۳ ترجمہ آیات ۱-۳

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالْعَصْرِ (۱)

لفظ عصر کی تحقیق

'و' قسم کے لیے ہے اور 'عَصْرٌ' کے معنی زمانہ کے ہیں۔ استاذ امام مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اس لفظ کی جو تحقیق اپنی تفسیر سورۂ عصر میں بیان فرمائی ہے اس کا خلاصہ ہم اپنے لفظوں میں پیش کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں :

"عصر کے معنی زمانہ کے ہیں۔ جس طرح لفظ 'دَھْرٌ' میں زمانہ کی مجموعیت کا اعتبار ہے اسی طرح لفظ 'عَصْرٌ' میں اس کے گزرنے اور اس کی تیز روی کی طرف اشارہ ہے چنانچہ اس کا غالب استعمال گزرے ہوئے زمانہ ہی پر ہوتا ہے۔ امرؤ القیس کا مصرعہ ہے :

وھل ینعمن من کان فی العصر الخالی

(اور اب ان کے لیے کیا مبارکی ہے جو گزرے ہوئے زمانوں میں ہوئے)

عبید بن الابرص نے کہا ہے :

فذالک عصر قد ارانی یحملنی بازل شبوب

(وہ بھی زمانہ تھا جب میں اپنے کو دیکھتا کہ ایک جوان اور خوبصورت اونٹنی پر سوار ہوں)"

کلامِ عرب کی روشنی میں لفظ کی تحقیق بیان کرنے کے بعد مولانا خلاصۂ بحث پیش کرتے ہیں :

"اس سے معلوم ہوا کہ لفظ 'عَصْرٌ' ایک طرف زمانۂ گزشتہ کے احوال و واقعات یاد دلا رہا ہے دوسری طرف اس کی مخصوص صفت تیز روی اور برق رفتاری کی طرف بھی متوجہ کر رہا ہے۔ ان دونوں حقیقتوں کی طرف اشارہ سے ہمارے سامنے دو اہم نتائج آتے ہیں۔ ایک یہ کہ انسانوں پر اللہ تعالیٰ کے فیصلے ان کے اعمال کے اعتبار سے نافذ ہوں گے۔ دوسرا یہ کہ ہم کو زمانہ سے جس کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کی تیز روی اور برق رفتاری ہے، زیادہ سے زیادہ مستعدی سے فائدہ اٹھا لینا چاہیے۔"

اب اس سوال پر غور کیجیے کہ زمانہ کی قسم یہاں کیوں کھائی گئی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس قسم سے ایک طرف تو اللہ تعالیٰ نے تاریخ کے ان واقعات کی طرف توجہ دلائی ہے جو اس دنیا میں قانونِ مجازات کے ظہور کے پیش آئے اور جو قرآن اور دوسرے آسمانی صحیفوں میں بیان ہوئے ہیں۔ دوسری طرف لوگوں کو اس سے جھنجھوڑا ہے کہ لوگ اپنی زندگیاں غفلت میں نہ گزاریں بلکہ پڑی

مستعدی سے ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں۔ انہی تیز رو لمحات کے بدلے وہ ابدی بادشاہی حاصل کر سکتے ہیں اگر انھوں نے ان کی صحیح قدر پہچانی اور اگر ان کی قدر نہ پہچانی تو یاد رکھیں کہ یہ ان کے لیے ابدی لعنت بن جائیں گے۔

مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اس نکتہ کی وضاحت اپنی تفسیر میں یوں فرمائی ہے:

"پچھلی قوموں پر اللہ تعالیٰ کے جو فیصلے نافذ ہوئے وہ ٹھیک ٹھیک ان کے اعمال کا بدلہ تھے۔ انھوں نے نیکیاں اور بھلائیاں کیں تو خدا نے ان کو عروج بخشا اور اگر انھوں نے ظلم و فساد کی راہ اختیار کی تو قانونِ الٰہی نے، اتمامِ حجت کے بقدر مہلت دینے کے بعد ان کو تباہ و برباد کر دیا۔ اسی حقیقت کی یاد دہانی کے لیے یہاں زمانہ کی قسم کھائی کہ لوگ یاد رکھیں کہ ایک دن اس قانونِ مکافات سے لازماً انھیں بھی دوچار ہونا ہے۔"

"علاوہ ازیں اس قسم میں ایک اور نازک نکتہ بھی مضمر ہے۔ وہ یہ کہ انسان کا اصل راس المال زمانہ ہی ہے اور اس کا حال یہ ہے کہ تیز روی اور برق رفتاری میں کوئی چیز بھی اس سے بڑھ کر نہیں ہے۔ پھر یہ انسان کی کیسی نادانی ہے کہ وہ زمانہ کی اس بے وفائی سے واقف ہونے کے باوجود اس پر بھروسہ کرتا اور زندگی کی بے ثباتی، قیامت کی بازپرس اور جزائے عمل کے قانون سے غافل رہتا ہے۔"

اس حقیقت کو مولاناؒ مثال سے یوں سمجھاتے ہیں:

"اس معاملے میں انسان کی مثال بالکل اس تاجر کی ہے جو برف کی تجارت کرتا ہے، لیکن بجائے اس کے کہ جلد سے جلد اس کو بیچ کر اپنے دام کھرے کرنے کی فکر کرے اس کو اس نے رکھ چھوڑا اور اس کی چمک اور ٹھنڈک کا تماشا دیکھ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے ناعاقبت اندیش تاجر کو بہت جلد اپنی غفلت پر کفِ افسوس ملنا پڑے گا۔"

اسی سلسلہ میں ایک اور نکتہ کی طرف مولاناؒ ان لفظوں میں اشارہ فرماتے ہیں:

"علاوہ بریں زمانہ کی تیز روی میں ایک پہلو بشارت اور تقویت صبر کا بھی ہے۔ وہ اس طرح کہ اس تھوڑی سی مدت میں اگر انسان چاہے تو اجر و ثواب کا ایک لازوال خزانہ جمع کر سکتا ہے۔ ایک بدبخت انسان اس حیاتِ فانی کی چند روزہ لذتوں پر ریجھ کر اپنے کو ابدی مسرت و کامیابی سے محروم کر لیتا ہے لیکن ایک عاقل اسی فانی زندگی کے چند دنوں کے اندر، جن کی حقیقت ایک خواب اور برق خاطف سے زیادہ نہیں، تقویٰ اور ضبطِ نفس کی آزمائشیں جھیل کر ...... خدا کی خوشنودی اور اس کی محبت کا ابدی تخت و تاج حاصل کر لیتا ہے۔"

إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ ۝ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۝ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝ (۲-۳)

اصل بات

یہ وہ اصل بات ہے جس کو ثابت کرنے کے لیے زمانہ کی قسم کھائی گئی ہے۔ جب ایک طرف مہلتِ حیات کی اہمیت اور قدر و قیمت کا حال یہ ہے کہ اسی کے بدلے میں انسان ابدی بادشاہی حاصل کر سکتا ہے اور اگر اس سے غفلت برتے تو یہ اس کے لیے ابدی لعنت بن جاتی ہے۔ دوسری طرف اس کی تیز روی کا یہ حال ہے کہ ہر سیکنڈ کے ساتھ وہ ماضی کے اندر تحلیل ہوتی جا رہی ہے اور اس پر انسان کو کوئی قابو نہیں تو وہ سارے انسان انتہائی خسارے میں ہوئے جن کا اصل راس المال اس تیزی سے برباد ہو رہا ہے اور وہ اس سے غافل ہوں۔ چنانچہ اس کو شہادت میں پیش کر کے فرمایا کہ انسان گھاٹے میں ہیں بجز ان کے جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے۔

اس سے معلوم ہوا کہ زندگی کی ساری قدر و قیمت ایمان اور عمل صالح کے اندر مضمر ہے۔ خالق نے یہ عطا فرمائی ہی اس لیے ہے کہ انسان اس کو شیطان کے علی الرغم اپنے رب کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق گزارے اور اس کے صلہ میں 'رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً' کی سند اور ابدی جنت کا ٹکٹ حاصل کر لے۔ چند دنوں کے امتحان کے بدلے میں ابدی جنت کا انعام جس طرح کوئی معمولی انعام نہیں اسی طرح اس کو شیطان کی ترغیبات کے جال میں پھنس کر کھو بیٹھنا بھی کوئی معمولی محرومی نہیں ہے۔

ایمان کا مفہوم

ایمان کی تعریف اس کتاب میں جگہ جگہ بیان ہو چکی ہے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھیے کہ خدا کو اس کی تمام صفات اور ان کے لازمی مقتضیات کے ساتھ پورے صدقِ دل سے تسلیم کرنا ایمان ہے۔ استاذ امام فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں ایمان کا مفہوم ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

> "ایمان کی اصل 'امن' ہے۔ یہ لفظ لغت میں مختلف معانی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ 'اٰمَنَهٗ' ای اعطاہ امنًا (اس کو امن دیا) قرآن میں ہے: 'وَاٰمَنَهُم مِّنْ خَوْفٍ' (قریش - ۱۰۶: ۴) (اور ان کو خوف سے امان دی)۔ 'اٰمَنَ لَهٗ' صدقہ و اعتمد علیہ (اس کی تصدیق کی، اس پر اعتماد کیا) 'اٰمَنَ بِهٖ' ایقن بہ (اس کا یقین کیا)"

> "قرآن مجید میں یہ لفظ مذکورہ تمام صورتوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس کے مشتقات میں سے لفظ 'مُؤْمِنٌ' اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اپنی پناہ میں آنے والے بندوں کو پناہ دیتا ہے۔"

> "یہ ایک قدیم دینی اصطلاح بھی ہے .... پس وہ یقین جو خشیت، توکل اور اعتقاد کے تمام لوازم و شرائط کے ساتھ پایا جائے، ایمان ہے اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر، اس کی آیات پر، اس کے احکام پر ایمان لائے، اپنے آپ کو اس کے حوالہ کر دے

اس کے فیصلوں پر راضی رہے وہ مومن ہے۔"

عملِ صالح

ایمان کے بعد عملِ صالح کی حیثیت اس کے لازمی مقتضی کی ہے۔ جب حقیقی ایمان پیدا ہو گا تو وہ لازماً زندگی کے باطنی گوشوں کی طرح اس کے ظاہری اعمال کو بھی منور کرے گا۔ اگر ایمان سے سے اس کے تقاضوں کے مطابق عمل نہ پیدا ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ایمان نے دل میں جڑ نہیں پکڑی۔ ایمان اور عمل میں مطابقت اور ہم آہنگی ہونا لازمی ہے۔ امام فراہیؒ اپنی تفسیر میں اس نکتہ کی وضاحت یوں فرماتے ہیں:

"قرآن مجید میں ایمان کے بعد عملِ صالح کا جو ذکر آتا ہے وہ درحقیقت ایک طرح کی تفصیل و توضیح ہوتی ہے...... اسی طرح اطاعتِ رسول کو اطاعت اللہ پر جو عطف کیا جاتا ہے یہ بھی عطفِ تفصیل ہوتا ہے...... اس تفصیل کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ بعض اہم الفاظ کے بعض پہلو مخفی رہ جاتے ہیں۔ ایمان کے معاملہ میں اس توضیح کی ضرورت بالکل ظاہر ہے۔ ایمان کا محل دل اور عقل ہے۔ عقل اور دل کے معاملات میں انسان نہ صرف دوسروں کو دھوکا دے سکتا ہے بلکہ بسا اوقات خود بھی دھوکے میں رہتا ہے۔ وہ اپنے کو مومن سمجھتا ہے حالانکہ وہ مومن نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے ایمان کے دو شاہد قرار دیے گئے۔ ایک قول اور دوسرا عمل۔ قول بھی چونکہ جھوٹ ہو سکتا ہے اس وجہ سے صرف زبان سے اقرار کرنے والا مومن نہیں قرار دیا گیا بلکہ ضروری ہوا کہ آدمی کا عمل اس کے ایمان کی تصدیق کرے۔[1] چنانچہ فرمایا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا (النساء - ۴ : ۱۳۶) — اے وہ لوگو جو زبان سے ایمان لائے ہو! عمل سے ایمان لاؤ۔"

اعمالِ حسنہ کو 'صالحات' سے تعبیر کرنے کی حکمت امام فراہیؒ نے ان الفاظ میں واضح فرمائی ہے:

اعمالِ حسنہ کو صالحات سے تعبیر کرنے کی حکمت

"اللہ تعالیٰ نے اعمالِ حسنہ کو صالحات سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس لفظ کے استعمال سے اس عظیم حکمت کی طرف رہنمائی ہوتی ہے کہ انسان کی تمام ظاہری و باطنی، دینی و دنیوی، شخصی و اجتماعی، جسمانی و عقلی صلاح و ترقی کا ذریعہ اعمالِ صالحہ ہی ہیں۔ یعنی عملِ صالح

---

[1] یہ امر واضح رہے کہ یہاں زیرِ بحث حقیقی ایمان ہے، فقہی اور قانونی ایمان پر بحث نہیں ہے۔ جو لوگ فقہی اور قانونی ایمان کی نوعیت سمجھنا چاہتے ہوں وہ اس بحث کو اس کے محل میں دیکھیں۔ مولانا فراہیؒ نے اس کے بعض اہم پہلوؤں کی طرف تفسیر سورۂ عصر میں اشارے کیے ہیں اور ہم نے بھی اس کتاب میں بعض جگہ اس کے بعض پہلو واضح کیے ہیں۔

وہ عمل ہوا جو انسان کے لیے زندگی اور نشو و نما کا سبب بن سکے اور جس کے ذریعہ سے انسان ترقی کے ان اعلیٰ مدارج تک پہنچ سکے جو اس کی فطرت کے اندر ودیعت ہیں۔"

آگے چل کر اس نکتہ کی مزید وضاحت انھوں نے یوں فرمائی ہے:

"اس نکتہ کو دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ سکتے ہیں کہ انسان کائنات کی مجموعی مشین کا ایک پرزہ ہے۔ اس وجہ سے اس کے اعمال میں سے صالح صرف وہی ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی اس حکمت و تدبیر کے موافق ہوں جو اس نے اس مجموعی نظام کے لیے پسند فرمائی ہے۔ اس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے بازیچۂ اطفال نہیں بنایا ہے، بلکہ ایک خاص نظامِ حکمت ہے جو اس پورے کارخانہ میں جاری ہے اور اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہے کہ اس کائنات کے اندر جو کچھ ہو اسی نظامِ حکمت کے تحت ہو، اس سے الگ ہو کر نہ ہو۔"

انسان پر اس کے معاشرہ کا حق

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ اوپر والے ٹکڑے میں جو بات ارشاد ہوئی ہے اس کا تعلق اصلاً انسان کی انفرادی زندگی سے ہے لیکن انسان صرف انفرادی زندگی نہیں رکھتا بلکہ وہ فطرتاً معاشرتی مزاج رکھنے والی مخلوق ہے اور جہاں بھی پایا جاتا ہے کسی خاندان کے رکن اور معاشرہ کے ایک فرد کی حیثیت سے ہی پایا جاتا ہے۔ اگر اس نے اس کے خلاف کوئی اور روش زندگی کی اختیار کی ہے تو اپنے فطری مزاج کے تقاضے سے نہیں بلکہ کسی غیر فطری انحراف کے باعث اختیار کی ہے۔ خاندان اور معاشرہ کے ساتھ اس کا تعلق فطری ہے۔ وہ جس طرح اپنی مادی زندگی کی تعمیر و ترقی میں ان سے سہارا حاصل کرتا ہے اسی طرح اپنے اخلاقی و روحانی ارتقا میں بھی ان سے رہنمائی پاتا ہے۔ یہیں سے اس پر خاندان اور معاشرہ کا یہ حق قائم ہو جاتا ہے کہ وہ ان کی صلاح و فلاح کے فرض سے غافل نہ رہے ورنہ یہ چیز اس کی فتوت کے خلاف ہوگی۔ فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ جو لوگ ایمان و عمل کی صراطِ مستقیم سے آشنا ہوں وہ دوسروں کو بھی اس حق کی تلقین کریں جس کی راہ ان پر ایمان و عمل صالح کی زندگی نے کھولی ہے اور ساتھ ہی ایک دوسرے کو صبر و عزیمت کی بھی تلقین کریں اس لیے کہ صبر و عزیمت کے بغیر نہ حق کو اختیار کرنا اور اس پر قائم رہنا آسان ہے اور نہ اس کی دعوت دینا کوئی سہل بازی ہے۔

ایک دقیق نکتہ

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ بات یوں نہیں فرمائی کہ 'وہ ایمان اور عمل صالح کی دعوت دیتے ہیں'، بلکہ یوں فرمائی کہ 'وہ حق اور صبر کی ایک دوسرے کو تلقین کرتے ہیں'۔ اس اسلوب نے وہ باتیں بھی اپنے اندر سمیٹ لی ہیں جو پہلے ٹکڑے میں ہیں اور ان کے اوپر مزید نہایت اہم اضافے بھی کر دیے ہیں۔ لفظ 'حق' کے اندر ایمان بدرجۂ اولیٰ داخل ہے اس لیے کہ وہ خدا کا حق اور سب سے بڑا حق ہے۔ اسی طرح اعمالِ حسنہ کا تعلق بھی یا تو خدا کے حقوق سے ہے یا بندوں کے حقوق سے اس وجہ

سے وہ بھی اس میں داخل ہیں۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ وہ یہ ساری باتیں حقوق اور فرائض کی طرح ادا بھی کرتے ہیں، دوسروں کو اس کی تلقین بھی کرتے ہیں اور ساتھ ہی یہ حکمت بھی لوگوں کو بتاتے ہیں کہ حقوق کو ادا کرنا کوئی سہل بازی نہیں ہے، اس کے لیے صبر و عزیمت ضروری ہے۔ جن کے اندر یہ وصف نہیں ہوگا ان کے لیے حقوق کا ادا کرنا نہایت مشکل ہے۔

حق کا مفہوم

'حق' کی وضاحت امام فراہیؒ نے اپنی تفسیر میں یوں فرمائی ہے:

"'حق' اصل میں کہتے تو ہیں موجود و قائم کو لیکن استعمال میں اس کے معنی مختلف ہو گئے ہیں۔ کم از کم تین معنوں میں تو اس کا استعمال معروف ہے:

۱۔ وہ بات جس کا واقع ہونا قطعی ہو۔

۲۔ وہ بات جو عقل کے نزدیک مسلّم ہو۔

۳۔ وہ بات جو اخلاقاً فرض ہو۔"

ان تینوں معنوں کی تائید میں قرآن سے دلائل نقل کرنے کے بعد مولانا فراہیؒ فرماتے ہیں:

"باقی رہا اس کا خاص مفہوم یعنی غریبوں اور کمزوروں کی ہمدردی تو وہ اسی عام معنی سے نکلا ہوا ہے۔ گویا اہلِ عرب کے نزدیک سب سے بڑا حق یہی ہے جو ہر صاحبِ استطاعت پر لازم ہے اور جو ہر مستحق کو حاصل ہونا چاہیے جو عقل کے نزدیک مسلّم اور تمام اچھے لوگوں کے نزدیک بالکل متعیّن و معروف ہے۔ اسی سبب سے احسان کو معروف کہتے ہیں یعنی ایک ایسی چیز جو ہر شخص کے نزدیک جانی پہچانی ہوتی ہے اور تمام معقول لوگوں کے اندر مسلّم قانون کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حق کے معنی اگر غریبوں کی ہمدردی کے لیے جائیں تو اس کے اندر ان تمام معانی کی جھلک موجود رہے جو اوپر مذکور ہوئے۔"

صبر کی تحقیق

'صبر' کی تحقیق کے ذیل میں مولانا فراہیؒ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ عربوں کے نزدیک صبر کوئی عجز و تذلّل کے قسم کی کوئی چیز نہیں ہے جو بے بسوں اور درماندوں کا شیوہ ہے بلکہ ان کے نزدیک یہی تمام قوت و استقامت کی بنیاد ہے۔ کلامِ عرب میں یہ لفظ بہت استعمال ہوا ہے اور اس کے تمام استعمالات سے اس حقیقت کی تائید ہوتی ہے۔ حاتم طائی کہتا ہے:

وغمرة موت ليس فيها هوادة ... يكون صدور المشرفي جسورها

(موت و ہلاکت کے کتنے ہولناک دریا جن پر تلواروں کے پل تھے)

صبرنا له في نهكها ومصابها ... بأسيافنا حتى يبوخ سعيرها

(ہم نے ان کی تمام آفات کے مقابلہ میں اپنی تلواروں کے ساتھ ثابت قدمی دکھائی یہاں تک کہ

وہ ٹھنڈے پڑ گئے"۔

بعض دوسرے مشہور شاعروں کے کلام سے نظائر پیش کرنے کے بعد مولانا فراہیؒ نے 'صبر' کا مفہوم خود قرآن سے ان الفاظ میں واضح فرمایا ہے:

" 'صبر' کا اصل مفہوم قرآن نے خود کھول دیا:

وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ (البقرۃ - ۲ : ۱۷۷) — اور صبر کرنے والے سختی میں اور تکلیف میں اور لڑائی کے وقت۔"

"اس آیت میں صبر کے تین موقعے ذکر ہوئے ہیں: غربت، بیماری اور جنگ۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ تمام مصائب و شدائد کے سرچشمے بھی تین ہیں جو ان تینوں امتحانوں میں ثابت قدم رہتے ہیں وہ صابر ہیں۔"

حق و صبر کے باہمی تعلق کی مزید وضاحت کرتے ہوئے مولانا فراہیؒ فرماتے ہیں:

"خلاصہ ان تفصیلات کا یہ ہے کہ 'حق' تمام بھلائیوں کے دروازے کھولتا ہے اور 'صبر' تمام برائیوں کے دروازے بند کرتا یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ 'حق' اصل محبوب و مطلوب ہے اور 'صبر' اس کے لیے جوش طلب اور سرگرمی ہے۔"

'اہل بصیرت سے یہ راز مخفی نہیں ہے کہ سعادت کے حاصل ہو جانے کے بعد اصلی چیز اس پر جمے رہنا ہے۔ اب غور کرو کہ دو لفظوں ——— حق اور صبر ——— کے اندر تمام سعادتیں اور بھلائیاں کس خوبی و اختصار کے ساتھ جمع ہو گئی ہیں۔ اور ان دونوں کے درمیان کس قدر گہرا اور وسیع تعلق ہے۔"

. . . .

"یہاں درحقیقت ایک ہی جڑ سے کئی شاخیں نکلی ہیں۔ ایمان ایک اصل اور مرکز کی حیثیت سے ہے۔ اس کے بعد عمل صالح کا ذکر اس کی تفصیل کی حیثیت سے آیا۔ اسی طرح حق چونکہ دل و دماغ دونوں کو محبوب ہے اور اسی پر ان دونوں کے عروج و کمال کا انحصار ہے اس وجہ سے اس کی محبت کے نتیجہ کے طور پر صبر کا بیان ہوا۔ محبت کا تقاضا یہ ہے کہ محبوب کے لیے آدمی کے اندر ثابت قدمی اور استقامت پیدا ہو۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ یہ ثابت قدمی اور استقامت محبوب کی حیثیت کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ جو شے جس قدر محبوب ہوگی اس کے لیے اسی قدر پامردی و استقلال کا جوش اُبلے گا۔ نفرت، غضب اور غیرت کے جذبات کا ظہور ہر شے کے لیے یکساں نہیں ہوتا بلکہ مختلف درجہ کا ہوتا ہے۔ دل کو جو شے جس قدر عزیز ہوتی ہے اس کے لیے اسی درجہ کا جذبۂ غیرت و حمیّت بھڑکتا ہے۔"

"اللہ تعالیٰ کے غضب اور انتقام کی بنیاد بھی یہی ہے کہ اس کو حق عزیز و محبوب ہے اس وجہ سے جو لوگ اس کو پامال کرتے ہیں ان پر اس کا قہر و غضب بھڑکتا ہے۔ جو شے تم کو عزیز و محبوب ہو گی کیا تم اس کی تحقیر و اہانت چپ چاپ برداشت کر لوگے؟ اس کی حمایت کے لیے تمہاری غیرت ضرور جوش میں آئے گی۔ ماں اپنے بچہ سے محبت کرتی ہے اور تم دیکھتے ہو کہ یہ محبت تنہا نہیں ہوتی بلکہ اپنے ساتھ ایک مجنونانہ غیرت بھی رکھتی ہے اور جب وقت آتا ہے ماں کو بچہ کی مدافعت میں قربان کر دیتی ہے۔ یہی جوشِ غیرت و حمایت قوموں میں اپنے قومی حقوق و مطالبات کے لیے ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک مسکین کبوتری بھی اپنے انڈوں اور بچوں کے لیے اپنے اندر محبت کا جذبہ اور غیرت کا جوش رکھتی ہے۔ اگر تم اس کے انڈوں اور بچوں کو اس سے چھیننا چاہو گے تو وہ اپنے کمزور پروں سے ضرور تم کو دفع کرنے کی کوشش کرے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ صبر درحقیقت محبتِ حق سے پیدا ہوتا ہے۔"

ایک اور نازک سوال کا جواب

اب اس سوال پر غور کیجیے کہ 'ایمان و عملِ صالح' اور 'تواصی بالحق والصبر' میں باہم دگر کیا تعلق ہے؟ استاذ امام فراہیؒ اس سوال کا یہ جواب دیتے ہیں:

"وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر حق اور صبر کی صفات موجود ہیں اور یہاں پر عمل کرنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی ان کی دعوت دیتے ہیں۔ یہ مضمون آیت کے اندر مضمر ہے اور اس کی تصریح نہیں کی گئی ہے۔ اس کی وجہ اول تو یہ ہے کہ 'اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ' کے اندر یہ بات موجود تھی؛ ثانیاً وعظِ بے عمل کی برائی اس قدر واضح ہے کہ اس مدح کے محل میں یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ یہ لوگ دوسروں کو حق و صبر کی نصیحت کریں گے اور خود ان اوصاف سے محروم ہوں گے۔"

"اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح ایمان سے عملِ صالح وجود میں آیا اسی طرح 'عملِ صالح' سے 'تواصی' وجود میں آیا۔ جس شخص کی نگاہوں میں 'حق' محبوب ہو جائے گا اور وہ اس کی خاطر صبر و استقامت کی کڑیاں بھی جھیلنے پر آمادہ ہو گا اس کے بارے میں لازماً اس کا علم اس کی محبت اور اس کی غیرت بڑھ جائے گی۔ وہ صرف یہی نہیں چاہے گا کہ خود ہی اس سے محبت کرے بلکہ یہ بھی چاہے گا کہ ساری دنیا اس سے محبت کرے اور وہ جہاں کہیں بھی حق کو مظلوم و مقہور اور باطل کو غالب و فتحمند دیکھے گا، تڑپ اٹھے گا اور ایک غیور و اولوالعزم انسان کی طرح دوسروں کو بھی ابھارے گا کہ وہ حق کی حمایت کے لیے کمربستہ ہوں۔ اس کا دوسروں کو یہ ابھارنا بھی خود اس کے اپنے ہی جذبۂ حمیتِ حق کا ایک قدرتی نتیجہ اور اسی کا ایک حصہ ہے۔ پس یہاں 'تواصی' کا ذکر 'عملِ صالح' کے ایک

جزداوراس کی توضیح کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔"

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ اَوَّلًا وَّاٰخِرًا۔

لاہور

۲۴ - اپریل ۱۹۸۰ء

۸ - جمادی الثانی ۱۴۰۰ھ